رالف رسل

# شادم از زندگئ خویش

حال میں میرے دوست محمود ہاشمی نے مجھے فون کیا اور شکایت کی کہ آپ نے یہ کہا کہ آپ اختر انصاری کی ایک ادبی ڈائری کے نمونے پر کچھ لکھیں گے، لیکن جو آپ نے لکھا ہے اس میں ادبی باتیں بہت کم ہیں۔ ایک طرح ان کا اعتراض صحیح تھا۔ لیکن جب میں نے کہا کہ اب ادبی ڈائری کے نمونے پر لکھوں گا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ ادب سے متعلّق ہوگا بلکہ یہ تھا کہ جو باتیں وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں آئیں وہ لکھوں گا۔ میں نے ہاشمی صاحب کو یہ بھی بتایا کہ اس میں ادبی باتیں کم ہوں گی کیوں‌کہ جو کچھ مجھے لکھنا تھا ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں وہ میں کتابوں میں اور مضامین میں لکھ چکا ہوں اور یہاں ان باتوں کو دُہرانا بیکار تھا۔ AUS میں جو میرا لمبا مضمون "Urdu and I" کچھ سال پہلے شائع ہوا تھا اس میں غالباً میں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ میں کسی شاعر اور ادیب کے بارے میں کسی کا مضمون پڑھنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ میں نے اس شاعر یا ادیب کا مطالعہ خود نہ کیا ہو۔ اور اکثر میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ ایسے مضامین مجھے اچھے نہیں معلوم ہوئے۔ مثال کے طور پر میر حسن کی مثنوی پڑھنے کے بعد میں نے اس پر احتشام حسین کا مضمون پڑھا جسے پڑھ کر بڑی سخت کوفت ہوئی۔ آپ احتشام صاحب کے مضمون سے خیال کر ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ مثنوی پڑھنے کے لائق ہے۔ اصل میں احتشام صاحب اور ان کے ہم عصروں کے مضامین پڑھ کے میں محسوس کرتا تھا کہ ان کے پڑھنے سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔

غالباً سنہ پچاس کا زمانہ ہوگا جب میں نے حامد حسن قادری کی کتاب ’’داستان تاریخِ اردو‘‘ دیکھی۔ میرے نزدیک یہ بالکل لاجواب کتاب ہے۔ اور ایسی کتاب جسے احتشام صاحب کی نسل کے لوگ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد میں نے حامد حسن قادری صاحب کی دوسری کتابیں تلاش کیں اور جو کتابیں میں نے دیکھیں ان سے بہت متأثر ہوا۔

’’داستان تاریخِ اردو‘‘ پڑھنے کے بعد میرا جی چاہا کہ میں حامد حسن قادری صاحب سے جا کر ملوں۔ اس زمانے میں وہ پاکستان نہیں گئے تھے۔ اور میں خاص طور پر ان سے

ملنے کے لیے آگرہ گیا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔ (لگے ہاتھوں اس بات کا بھی ذکر کردوں کہ اس نسل کے لوگ مجھ سے ہمیشہ اسی طرح ملتے تھے۔ مثال کے طور پر جب اس کے کئی سال بعد میں لاہور جا کر غلام رسول مہر سے ملا تو وہ بھی اسی محبت سے پیش آئے۔)

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ حامد حسن قادری پرانے دور کے آدمی ہیں اور نئی چیزوں سے واقف نہیں ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے مضامین بعض اور نقّادوں کی نسبت بہت زیادہ مفید ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہے، ''تاریخ و تنقیدِ ادبیاتِ اردو،'' جو سب سے پہلے سنہ ۱۹۳۹ میں چھپی تھی۔ اس میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''شاعر کا رنگ۔'' یہ مضمون نہ صرف طالب علموں کے لیے مفید ہے بلکہ ہر سنجیدہ نقّاد کے لیے بھی، اگر وہ پڑھنے کی زحمت گوارا کرے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ شاعر کے رنگ کے معنی کیا ہیں اور مختلف شاعروں کے کلام کے نمونے پیش کرکے اس بات کو بالکل واضح کردیا ہے کہ کسی شاعر کے خاص رنگ کی خصوصیات کیا ہیں۔

ہر آدمی کسی نہ کسی حد تک اپنے زمانے اور اپنی قوم کے تصورات کا گویا اسیر ہوتا ہے۔ حامد حسین قادری کی کتابوں میں میں نے ایک خاص بات محسوس کی کہ ان کے تصورات میرے تصورات سے کافی مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ''داستانِ تاریخِ اردو'' اردو نثر کی تاریخ ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ حامد حسن قادری کے نزدیک افسانہ اور ناول نثر کی تعریف میں نہیں آتے۔ خدا کا شکر ہے کہ نذیر احمد کا کافی تفصیلی ذکر ہے، غالباً اس بنا پر کہ ناول کے علاوہ نذیر احمد نے کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی تھیں جو نثر کی اس محدود تعریف میں آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو نثر کی تاریخ میں سرشار اور شرر وغیرہ کے ناولوں کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا۔ ایک دوسری مثال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''انتخاب دیوانِ مومن مع شرح'' میں مومن کی اس مشہور غزل جس کی ردیف ہے ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے:

> یہ غزل بہت مشہور ہے۔ قدیم زمانے کے ''اربابِ نشاط'' کی زبانوں پر مدّتوں رہی ہے۔ پوری غزل اسی لہجے میں ہے اور اکثر اپنے ہی واقعات اور سرگزشتیں لکھی ہیں۔ غزل میں جو ''اشارتوں ہی سے

> گفتگو،'' ''بات کوٹھے کی،'' ''بگڑنا وصل کی رات'' ہے یہ سب واقعات مثنویوں میں تفصیل سے موجود ہیں مگر بعض باتیں ایسی کھلی اور ننگی ہیں کہ بس پڑھنے کی ہیں، یہاں لکھنے کی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ پڑھنے کی کوئی بات ایسی نہیں جو لکھی نہیں جا سکتی، بلکہ لکھی جانی چاہیے۔

جب قادری صاحب نے یہ لکھا کہ یہ باتیں لکھنے کی نہیں ہیں تو آپ کو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اُن میں ایسی باتوں کے خلاف تعصّب تھا۔ حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے ریختی کے بارے میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار کیا اور بعض ریختی گو شعراء کے اشعار کی تعریف کی۔

یہ باتیں لکھنے کے بعد میں پھر یہ کہوں گا کہ قادری صاحب کی کتابیں اور مضامین مجھے بہت پسند ہیں اور ان کے سنجیدہ مطالعے سے بہت سوں کا فائدہ ہوگا۔

میرا بہت پہلے سے خیال ہے کہ عام طور پر اہلِ اردو عشق کے ذکر سے کافی گھبراتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۵۸ میں جب میں نے غلام السیدین کی صدارت میں میر پر لیکچر دیا تو میں نے یہ بات کہی کہ اردو غزل کے سمجھنے کے لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ آپ سمجھیں کہ یہ ناجائز عشق کی شاعری ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ سیدین صاحب نے اور دوسرے سامعین نے اس پر سخت اعتراض کیا، حالانکہ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ میری اس بات کا برا ماننے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لیکچر کے بعد ایک صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ ہم پاک عشق کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پاک عشق کا احترام سبھی کرتے ہیں لیکن کون کہتا ہے کہ ناجائز عشق پاک عشق نہیں ہوسکتا۔ مجھے معلوم تھا کہ حالی نے ''مقدّمۂ شعر و شاعری'' میں یہ بات بالکل صاف طور پر لکھی تھی کہ اگر غزل کا معشوق عورت ہو تو وہ عورت یا تو طوائف ہوگی یا کسی کی منگیتر ہوگی یا کسی کی بیوی۔ تو اگر عشق ایسی عورت سے کیا جائے تو ظاہر ہے کہ معاشرے کی نگاہ میں یہ عشق ناجائز ہوگا۔ اب اس واقعے کے چالیس سے زیادہ سال کے بعد غالباً لوگ اب اس بات کا برا نہ مانیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس زمانے کے لوگ یقیناً عشق کرنے سے بچتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وحید قریشی نے میر حسن پر ایک

کتاب لکھی تھی اور اس بات پر لمبی چوڑی بحث کی ہے کہ جب میر حسن اپنے والد کے ساتھ دہلی چھوڑ کر لکھنئو کے لیے روانہ ہوے تو اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔ غالباً اس زمانے میں وہ بچہ تھے۔ میرے خیال میں اس بحث کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میر حسن نے اپنی مثنوی ''گلزارِ اِرم'' میں بالکل صاف طور پر یہ کہا ہے:

لگا تھا ایک بت سے واں میرا دل
ہوئی اس کی جدائی سخت مشکل

تو ظاہر ہے یہ بچپن کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ بات صرف ایسا آدمی لکھ سکتا تھا جس کی عمر اتنی تھی کو وہ کسی عورت سے عشق کرسکتا تھا۔ اسی بات سے متعلق ایک اور بات لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جب میں نے اور خورشیدالاسلام نے Three Mughal Poets لکھی تو ہم نے فرض کرلیا کہ میر نے اپنی مثنویوں میں جو عشق کا ذکر کیا وہ واقعی ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔ Frances Pritchett نے ہمیں بعد میں بتایا کہ اگر کوئی شاعر اپنے عشق کا ذکر کرے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے تجربے بیان کر رہا ہو۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اپنے تجربے لکھے ہوں یا نہ لکھے ہوں، ظاہر ہے کہ وہ تیار تھا کہ قاری یہ سمجھے کہ وہ اپنے تجربے بیان کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اگر اپنے تجربے نثر میں بھی لکھے تو آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ اس کا بیان سچ پر مبنی ہے۔

## لغتیں

میرے پاس ایک بہت اعلیٰ درجے کی لغت ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ ایک فرانسیسی ۔ انگریزی اور دوسرا انگریزی ۔ فرانسیسی۔ اس کے ۹۲۹ صفحے ہیں۔ میرے پاس دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۷ میں شائع ہوا۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نو آدمیوں نے مل کر اسے مرتّب کیا جن میں سے بعض انگریزی داں فرانسیسی تھے اور بعض فرانسیسی داں انگریز، اور ان کے مشترکہ کام کے نتیجے میں آپ کو ہر حصے میں وہ ساری معلومات ملیں گی جو انگریزی سیکھنے والے اور فرانسیسی سیکھنے والے یکساں طور پر مفید پائیں گے۔ میں اکثر اس ڈکشنری کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش ایسی ڈکشنری اردو میں بھی مرتب کی

جائے لیکن جب میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔ مثالی طریقہ یہ ہوتا کہ اردوداں انگریز اور انگریزی داں اردو اہلِ زبان مِل کر کام کریں۔ لیکن کتنے اردو داں انگریز ایسے ہیں جن میں یہ کام سنبھالنے کی صلاحیت ہے اور جن کو فرصت بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ بات قبول کرنی چاہیے کہ انگریزی ۔ اردو ڈکشنری کا کام اردو اہلِ زبان ہی سنبھال سکتے ہیں۔

جب میں مستند انگریزی ۔ اردو ڈکشنریوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں کافی خامیاں ہیں۔ میں نے تین ایسی لغتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مولوی عبد الحق کی STANDARD ENGLISH-URDU DICTIONARY جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اور جس کے ۱۵۲۵ صفحے ہیں۔ پھر جمیل جالبی کی QAUMI ENGLISH-URDU DICTIONARY جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی اور جس میں ۲۳۵٦ صفحے ہیں۔ پھر کلیم الدین احمد کی JAMI ENGLISH-URDU DICTIONARY جو ۱۹۹٤ء تا ۱۹۹۸ء شائع ہوئی۔ سب سے ضخیم لغت کلیم الدین احمد کی ہے۔ یہ چھ جلدوں میں چھپی ہے اور چوتھی جلد کو چھوڑ کے ہر جلد میں ہزار صفحے سے زیادہ ہیں۔

پہلے کلیم الدین احمد کی ڈکشنری کے بارے میں کچھ باتیں لکھنا چاہوں گا۔ پہلی جلد کے پیش لفظ میں جملہ آتا ہے: ”۱۹۷۵ء میں پہلی جلد کی تکمیل کے فوراً بعد ترقی اردو بیورو کو اس لغت کی اشاعت کا کام ہاتھ میں لے لینا چاہیے تھا مگر بد قسمتی سے اس کی طرف توجہ نہ کی گئی اور ایک کے بعد ایک جلد مکمل ہوتی گئی اور صرف واحد الماری کی زینت بنتی چلی گئی۔“

(اس ”بد قسمتی“ کے پیچھے ایک کافی شرم ناک کہانی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل آپ میرے انگریزی مضمون "Urdu in Independent India" میں پڑھ سکتے ہیں۔)

اب جو میں نے پہلی جلد کھولی تو فوراً میں نے دیکھا کہ اس میں کچھ عجیب غلطیاں ہیں۔ مثال کے طور پر اسی پیش لفظ میں کچھ الفاظ دیے گئے ہیں اور ان میں سے ایک ہے "teen-age" ۔ اس کا ترجمہ یہ دیا گیا ہے: ”عہدِ طفلی، بچپن کا دور،“ جو ظاہر ہے کہ بالکل غلط ہے۔ جب میں نے چھٹی جلد میں دیکھا تو "teen-age" اور "teen-ager" کا ترجمہ صحیح تھا۔ "teen-age" کا ترجمہ یہ دیا گیا کہ ”تیرہ سے انّیس سال کا،“ اور "teen-ager" کا ترجمہ یہ دیا گیا کہ ”تیرہ تا اُنیس سالہ عمر کا لڑکا یا لڑکی۔“ میں نے اِدھر اُدھر سے اُلٹ پُلٹ کر

دیکھا تو دوسری کافی نمایاں غلطیاں پائیں۔ مثال کے طور پر "agony," "Breeches Bible," "breathe in," "waste breath" ان سب کا ترجمہ یا تو ناقص ہے یا بالکل غلط۔ پھر اس میں "ISBN No." لکھا ہے مگر کوئی نمبر نہیں دیا گیا۔

ان تینوں لغتوں میں تین نمایاں خامیاں ہیں۔ پہلی یہ کہ ان سب میں ایسے انگریزی الفاظ ہیں جن سے میں واقف نہیں ہوں اور جن سے میرا خیال ہے بہت کم انگریز واقف ہوں گے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ شامل کرنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تینوں میں دوسری خامی یہ ہے کہ الفاظ کا تلفّظ نہیں بتایا گیا۔ آپ شاید سمجھیں کہ چوں کہ یہ لغتیں اردوداں لوگوں کے لیے ہیں تلفظ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن مجھے اس بات سے اتفاق نہیں۔ ۱۹۹۵ء میں پاکستان کے مقتدرہ قومی زبان نے ایک ''فرہنگِ تلفظ'' شائع کی۔ اسے شان الحق حقی نے مرتب کیا اور اس کے ۹۸٤ صفحے ہیں۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ اردودانوں کے لیے بھی کافی الفاظ کا تلفظ بتانے کی ضرورت ہے۔ تیسری خامی یہ ہے کہ الفاظ تو دیے گئے مگر ان الفاظ کا جملے میں استعمال نہیں بتایا گیا۔ مثلاً "embrace" کے معنی دیے گئے ہیں ''بغل گیر ہونا،'' اور ہونا چاہیے تھا ''سے بغل گیر ہونا۔''

اس سال یعنی ۲۰۰۱ کے شروع میں مجھے معلوم ہوا کہ OUP پاکستان نے پچھلے سال THE OXFORD ELEMENTARY LEARNER'S ENGLISH-URDU DICTIONARY کے نام سے٤٤۲ صفحے کی ایک نئی ڈکشنری شائع کی ہے۔ یہ دراصل THE OXFORD ELEMENTARY LEARNER'S DICTIONATY OF ENGLISH کا اردو ترجمہ ہے جو سارہ نقوی نے کیا ہے اور جس پر نظرثانی سلیم الرحمان نے کی ہے۔ مجھے یہ خبر سن کے بڑی خوشی ہوئی۔ اس لیے کہ اس میں صرف وہ الفاظ درج ہیں جو انگریزی میں عام ہیں اور سائنس کی اصطلاحات صرف وہی دی گئی ہیں جن سے عام انگریز واقف ہیں۔ دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر الفاظ کے ساتھ چھوٹے انگریزی جملے اردو ترجمے کے ساتھ دیے گئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان الفاظ کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "hug" کے ساتھ یہ جملہ دیا گیا ہے "he gave his brother a hug" اور اس کا اردو ترجمہ ''وہ اپنے بھائی سے بغل گیر ہوا۔'' اس طرح پتا چلتا ہے کہ ''بغل گیر ہونا'' ''سے'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

میں نے پہلے سارہ نقوی کا نام نہیں سنا تھا اور نہ سلیم الرحمان کا، لیکن جب میں نے اتفاق سے اپنے دوست David Page سے سارہ نقوی کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ

سارہ نقوی کوجانتے ہیں اور یہ کہ ایک زمانے میں وہ BBC کی ''ورلڈ سروس'' میں کام کرتی تھیں۔ ڈیوڈ نے کہا کہ کہیے تو میں آپ کی ملاقات سارہ نقوی سے کرادوں۔ اور حال میں میں ان سے جا کر ملا۔ جانے سے پہلے میں نے ڈکشنری کے کچھ صفحے دیکھے، اور مجھے معلوم ہوا کہ ان صفحوں میں کافی غلطیاں ہیں۔ میں نے سارہ نقوی کو فون کیا اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہوں گا اور بتانا چاہوں گا کہ میرے نزدیک آپ کی ڈکشنری میں کیا غلطیاں ہیں۔ آپ اس کا برا تو نہیں مانیں گی؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، بالکل نہیں۔ آپ شوق سے آئیے اور تفصیلی گفتگو کیجیے۔ جب میں گیا تو میں نے ۲۷ غلطیاں بتائیں۔ مجھے تعجب ہوا اور خوشی بھی کہ ایک آدھ کے سوا انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔ یہاں تفصیل دینے کی ضرورت نہیں لیکن دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ "raspberry" کے معنی دیے گئے ہیں ''رس بھری۔'' یہ بالکل غلط ہے۔ ''رس بھری'' کا پھل "raspberry" سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے لیے صحیح انگریزی لفظ "physalis" ہے۔ بہت سال پہلے جب میں ہندوستان گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ ''رس بھری'' بازار میں بِکتی اور کافی سَستی ہوتی ہے۔ میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ تو وہی چیز ہے جو میرے بچپن میں ہمارے باغیچے میں ہوتی تھی۔ اس پر ایک بہت خوبصورت پھول لگتا تھا۔ سرخ رنگ کا۔ ہم اسے"Chinese lantern" کہتے تھے۔ اس کے اندر ایک چھوٹا گول بیر کی طرح کا پھل ہوتا تھا، اور کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پھل کھایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جب میں نے رس بھری دیکھی تو دیکھا کہ اس کا پھل چھلکے کے غلاف کے اندر ہوتا ہے اور اس غلاف کا رنگ سرخ نہیں بالکہ زردی مائل سبز ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ بالکل وہی چیز نہو جس کے پھل کا غلاف سرخ رنگ کا ہوتا ہے، لیکن حال میں مجھے پتا چلا کہ اگر ذرا مختلف ہو بھی تو آپ دونوں کی بیری کھا سکتے ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ دوسری انگریزی ۔ اردو لغتوں میں بھی "raspberry" کے معنی ''رس بھری'' ہی دیے گئے تھے۔ اس لیے میں نے ان تینوں لغتوں میں دیکھا جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ تینوں میں"raspberry" کا ترجمہ ''رس بھری'' دیا گیا ہے۔ البتہ عبد الحق، جمیل جالبی، اور کلیم الدین احمد سب کی لغتوں میں ''رس بھری'' کے ساتھ ایک اور لفظ ''توتِ فرنگی'' بھی لکھا ہے، اور کلیم الدین احمد کی لغت میں تو اس کے علاوہ ''علیق'' بھی دیا گیا ہے۔ میں نے ''توتِ فرنگی'' کا لفظ کبھی نہیں دیکھا تھا، اور قادری صاحب نے مجھے بتایا کہ

''توت'' انھوں نے ''شہتوت'' کے لفظ سے لیا اور اردو میں یہ لفظ مفرد [یعنی محض ''توت''] مستعمل نہیں۔ اور ''علیق'' کا لفظ اردو میں نہ میں نے سنا نہ قادری صاحب نے۔

اب "lavatory" کا لفظ میں نے چاروں لغتوں میں دیکھا۔ کسی میں بھی ''پاخانہ'' کا لفظ نہیں دیا گیا، جو کچھ ہی دن پہلے بالکل عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انگریزی لفظ "toilet" اور "bathroom" بھی درج ہونے چاہیے تھے۔ اس لیے کہ عام طور پر اردو اہلِ زبان یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عبد الحق کی لغت میں دو لفظ دیے گئے ہیں ''طہارت خانہ'' اور ''بیت الخلاء۔'' ''بیت الخلاء'' کے لفظ سے میں واقف تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اب تقریباً متروک ہے۔ ''طہارت خانہ'' — یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے شاید ہی کوئی استعمال کرتا ہو۔ کلیم الدین احمد کی لغت میں بھی صرف ''طہارت خانہ'' اور ''بیت الخلاء'' درج ہے۔ جمیل جالبی کی لغت میں ''طہارت خانہ'' درج ہے اور ''بیت الخلاء'' نہیں۔ سارہ نقوی کی لغت میں "lavatory" کے یہ معنی دیے گیے ہیں: ''بیت الخلاء، کموڈ، قدمچہ۔'' جب میں نے ان سے ذکر کیا تو وہ مانیں کہ ''کموڈ'' اور ''قدمچہ'' دونوں غلط ہیں۔ اس لغت میں بھی ''پاخانہ،'' ''باتھ روم'' اور ''ٹوائلٹ'' کے الفاظ نہیں دیے گئے۔ قادری صاحب نے بتایا کہ اگر آپ انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیں تو اردو میں کئی اور لفظ ہیں — مثلاً ''جائے ضرور'' — جو دیے جا سکتے تھے۔ ان چاروں لغتوں میں سے کسی میں یہ الفاظ درج نہیں ہیں، البتہ سارہ نقوی کی ڈکشنری میں "lavatory" کے نیچے یہ بھی لکھا ہے کہ ''عام طور پر lavatory کی جگہ لفظ toilet استعمال ہوتا ہے۔'' اور "toilet" کے ذیل میں ''ٹوائلٹ'' اردو میں بھی دیا گیا ہے۔

سارہ نقوی سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے سن کر تعجب ہوا کہ وہ ''غِلاف'' کو ''غُلاف'' اور ''مستقبِل'' کو ''مستقبَل'' کہتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے ہمیشہ ''مستقبِل'' اور ''غِلاف'' سنا ہے، کبھی کسی کو ''غُلاف'' اور ''مستقبَل'' کہتے نہیں سنا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں ''غُلاف'' اور ''مستقبَل'' صحیح ہیں۔ اس کے بعد جب میں گھر پہنچا تو میں نے حقی صاحب کی ''فرہنگِ تلفّظ'' میں دیکھا کہ ''غِلاف'' اور ''مستقبِل'' ہی دیے گئے ہیں۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ اتنی بڑی لغتِ تلفظ کی ترتیب کی ضرورت غالباً اس لیے ہوئی کہ چوں کہ اردو لکھنے میں عام طور پر زیر زبر پیش لکھے نہیں جاتے اس لیے مختلف لوگ مختلف تلفظ کرتے ہیں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ جب میں پہلی بار علی گڑھ گیا، سنہ ۴۹

میں، تو میں نے دیکھا کہ مسعود حسین خاں ''شِکست'' نہیں کہتے، ''شَکِست'' کہتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی اور سے یہ تلفظ نہیں سنا۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ کسی ایک اہلِ زبان کے تلفظ کو صحیح نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہی صحیح ماننا چاہیے جو عام طور پر باخبر اہلِ زبان کرتے ہیں۔

[مسلسل]